دارالعلوم دیوبند
کے
۱۰۰
سو سال
مختار جاوید
عظیم پبلی کیشنز — لاہور (پاکستان)

محترم جناب پروفیسر غلام سرور رانا صاحب زید مجدہ

رکن مجلس عاملہ پاکستان نیشنل رائٹرز گلڈ

کی نذر

منجانب:

پاکستان نیشنل رائٹرز گلڈ ۔ لاہور

۱۴ محرم الحرام ۱۴۰۱ھ

برصغیر پاک و ہند کی صد سالہ تاریخ کے مختلف ادوار
میں دارالعلوم دیوبند کے کردار کا
مختصر جائزہ
دارالعلوم دیوبند
کے
سو سال
مختار جاوید
عظیم پبلی کیشنز، لاہور
(پاکستان)

نام کتاب ——— دارالعلوم دیوبند کے سو سال

تالیف ——— مختار جاوید

کتابت ——— ابوالفیصل محمد امین خان

پروف ریڈنگ ——— ظہیر الدین خان

مطبع ——— تاج الدین پرنٹرز لاہور

ناشر ——— عظیم پبلی کیشنز لاہور

اشاعت اول ——— اکتوبر ۱۹۸۰ء

تعداد ——— ایک ہزار

قیمت ——— تین روپے

ملنے کا پتا

عظیم پبلی کیشنز

پوسٹ بکس ۱۹۹۶

لاہور

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر

افتتاحیہ

آبادی کے لحاظ سے دُنیا کی دُوسری بڑی ـــــ اور قدرتی وسائل سے مالا مال ہونے کے باوجود مُسلمان آج سب سے زیادہ پسماندہ، گوناگوں مسائل میں گھری ہوئی اور اغیار کی دست نگر ـــــ قوم نظر آتی ہے۔

کہیں افغانستان کے جسم پر رُوسی بھیڑیوں کے دانت گڑے ہیں تو کہیں بھارت کی "کالی ماتا" رگِ کشمیر سے لہو چوستی نظر آتی ہے۔ فلسطینی غریب الوطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں تو مُسلمانوں کا قبلۂ اول نرغۂ اسرائیل میں محصور ـــــ حد یہ ہے کہ اس ناپاک قوم نے اب القدس شریف کو اپنا مستقل دارالحکومت قرار دے کر عالمی ضمیر کے منہ پر زناٹے دار تھپڑ رسید کیا ہے۔

عالمِ اسلام کی یہ رسوائی اور کس مپرسی بلاوجہ نہیں ہے۔ ہم آج بھی خدا اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بھروسہ کرنے کے بجائے ماسکو اور واشنگٹن پر تکیہ کیے ہوئے ہیں۔ ہم اتفاق و اتحاد کے بجائے باہم دست و گریبان ہیں۔ جبکہ مُسلمانوں کو زک پہنچانے کے لیے عملاً تمام غیر مُسلم متحد و متفق اور الکفر ملۃ واحدہ کی تفسیر ہیں۔ اگر ایک سوپر طاقت اسرائیل کو مسلح کرنے میں کوشاں ہے تو دُوسری بھارت کو بارود کا ڈھیر بنانے میں مصروف ہے۔ یہود و ہنود کو میزائلوں اور بموں سے لیس کیا جا رہا ہے لیکن پاکستان کا پُرامن ایٹمی پروگرام بھی تقریباً سبھی غیر مُسلم ممالک کو "اسلامی بم" نظر آتا ہے۔

دراصل یہ ساری افتاد اللہ اور اس کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح ہدایات سے روگردانی کا نتیجہ ہے۔ مختلف اسلامی ممالک کے غیر مسلم عالمی طاقتوں سے تعلقات کو سامنے رکھیے اور قرآن کے ان واضح احکام کو دیکھیے۔

ئہ غنیمت ہے کہ جنرل اسمبلی کے بعد اب سلامتی کونسل نے بھی اسرائیل کے اس اقدام کی مذمت کی ہے۔

"مسلمان کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں مسلمانوں کو چھوڑ کر۔ اور جو ایسا کریگا اسے اللہ سے کچھ تعلق نہ رہا۔"[1]

اور

"اے ایمان والو! غیروں کو اپنا رازدار نہ بناؤ۔ وہ تمہاری بُرائی میں کمی نہیں کرتے۔ اُن کی آرزو ہے جتنی ایذا تمہیں پہنچے ......"[2]

آج ہم جس قسم کے حالات سے دوچار ہیں نئے نہیں ہیں۔ بدقسمتی سے تاریخ کے مختلف ادوار میں ہم ایسی ٹھوکریں بارہا کھا چکے ہیں۔ چشم فلک نے برصغیر پاک و ہند کی گزشتہ صدی میں ایسے شرمناک مناظر متواتر دیکھے ہیں۔ وہ لوگ جو علم دین کے ادراک کے مدعی اور "شیخ الاسلام"، "شیخ القرآن"، "شیخ الحدیث"، "ابوالکلام"، "امیر شریعت"، "امام الہند"، "شیخ الہند" اور "مفتی اعظم" قسم کے بھاری بھرکم القابات سمیٹے ہوئے تھے ـــــ ہندو کی محبت میں اس قدر وارفتہ ہوئے کہ دولتِ دُنیا کے ساتھ ساتھ متاعِ دین بھی گنوا بیٹھے ـــــ وہ کلمہ گو مسلمانوں کو کفر و شرک کی توپوں سے چھلنی اور بدترین قسم کی فرقہ بندی کی نشوونما کرتے رہے ـــــ اور اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑنے کے بجائے گاندھی کی چوٹی سے چمٹ کر رہ گئے۔

لیکن ہندو کی چوکھٹ پر یہ تمام سجدہ ریزیاں اکارت گئیں اور معروف صحافی الطاف حسین قریشی کے الفاظ میں۔

> "وہ نیشنلسٹ مسلمان جنہیں اپنی قومی خدمات پر بڑا ناز تھا اور ہمیشہ اپنے ہم مذہبوں کی ناراضگی مول لے کر ہندو کانگریس کا ساتھ دیتے رہے تھے تقسیم کے موقعہ پر ہندوؤں اور سکھوں کے عتاب سے نہ بچ سکے، یہاں تک کہ پاکستان مُردہ باد کے نعرے لگانے والے مسلمان بھی اس جرم میں مارے گئے کہ آخر یہ مسلمان تو ہیں۔"[3]

---

[1] سُورۃ آل عمران آیت ۲۸ [2] سُورۃ آل عمران آیت ۱۱۸

[3] ہفت روزہ زندگی لاہور، ۷-۱۳ جولائی ۱۹۷۸ء صفحہ ۴

اس عید الفطر پر مُراد آباد کے مُسلمانوں پر جو قیامت ٹوٹی ہے اس کا سلسلہ وسیع ہو کر اب بھارت کے مختلف شہروں کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے سینکڑوں مسلمان شہید ہو چکے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں گرفتار کیے جا چکے ہیں. عفت مآب خواتین کی عصمت و عزت ہندو غنڈوں کے رحم و کرم پر ہے۔

حالیہ مسلم کش فسادات بھارت کی تاریخ کے بدترین سہی اولین ہرگز نہیں ہیں۔ خالد لطیف گابا کے الفاظ ہیں۔

"۱۹۶۴ء میں آزادی ملے سترہ برس ہوئے تھے ...... کلکتہ میں مرنے والے مسلمانوں کی تعداد بیس ہزار تھی۔ بنگلی کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہوگی کہ مسلمان متاثرین کے کیمپ پر مشین گنوں سے حملہ کر دیا گیا، ان کا راشن روک دیا گیا اور دس ہزار مسلمانوں کو قتل کر دیا گیا۔

ستمبر ۱۹۶۹ء میں کم از کم چار ہزار مسلمان ان فسادات کی نذر ہوئے۔ لاشیں اس کثرت سے تھیں کہ انہیں بڑی خندقوں میں پھینک کر مٹی سے ڈھانپ دیا گیا ..... متعدد لوگوں پر تیزاب پھینکا گیا اور ان کے جسم کے نازک حصّوں کو گرم آہنی سلاخوں سے داغ دیا گیا۔

جب اندرا گاندھی احمد آباد کے ہوائی اڈے پر اُتریں تو انہوں نے دیکھا کہ تباہ اور جلی ہوئی عمارتوں میں ایک آدھ جلی ہوئی لاش کو کتا جھنجھوڑ رہا تھا۔ عورتیں، بچے، مرد سہمے ہوئے ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے اور چلا رہے تھے۔"[1]

اس قسم کے جبرناک واقعات کے بعد ذہنوں میں تبدیلی فطری بات ہے۔ لطیف گابا ہی کے الفاظ ہیں۔

"گھناؤنا اور افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ سطریں ایک ایسا شخص لکھ رہا ہے جس نے تقسیم ہند کی شدت سے مخالفت کی تھی لیکن بھارت میں ۲۰ سال سے زائد

---

[1] خالد لطیف گابا: مجبور آوازیں: تلخیص از ایم افضل بحوالہ روزنامہ نوائے وقت لاہور مورخہ ۱۲ اگست ۱۹۸۰ء

عرصہ تک بطور شہری رہنے کے بعد یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ جن سیکولرازم کے بہت دعوے کیے جاتے ہیں وہ بالکل کھوکھلا ہے۔" [١]

دو قومی نظریے کے مخالف ایک مسلمان ادیب کا پچھتاوا بھی ملاحظہ ہو۔

" دہلی میں میرے خالو اور ان کا پورا خاندان قتل ہوگیا۔ ایک بچی زخمی حالت میں لاشوں کے ڈھیر کے نیچے سے ملی۔ ایک لڑکا نہ جانے کس طرح بچ نکلا میرے عزیز اور دوست مجھ سے پوچھتے تھے، تمہاری متحدہ قومیت کہاں ہے۔ تمہارا مشترکہ کلچر کیا ہوا۔ تمہارے وہ تصورات کہاں ہیں کہ قومیں مذہب کی بنیاد پر نہیں بنا کرتیں۔ تم تو کہتے تھے کہ ہندو اور مسلمان ایک قوم ہیں۔ تم تو کہتے تھے کہ ہندو مسلمانوں کے خون کے دشمن نہیں ہیں، تم تو کانگریس کی وسیع دلی اور بے تعصبی کے قائل تھے۔

آج میرے چاروں طرف آگ ہے اور میں حویلی کے اوپر والے کمرے میں خاموش بیٹھا گھنٹوں سوچتا ہوں کہ میں کس قدر غلط تھا۔" [٢]

لیکن شاید بعض دلوں اور دماغوں پر اللہ نے مہر کردی ہے کہ وہ محسوس کرنے اور سمجھنے سے بالکل عاری ہوگئے ہیں۔ تحریک پاکستان کی مخالفت میں ہندو کانگریس کا ساتھ دینے والے کانگریسی علماء اب بھی اپنے دارالعلوم ـــــ دیوبند ـــــ کے جشن میں ہندو لیڈروں کو مدعو کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی دعوتیں اڑانا عین خدمتِ اسلام سمجھتے ہیں۔

اخباری اطلاعات کے مطابق

" اندرا گاندھی کے بیٹے سنجے گاندھی نے کھانے کا وسیع انتظام کر رکھا تھا۔ سنجے گاندھی نے تقریباً پچاس ہزار افراد کو تین دن کھانا دیا۔ جو پلاسٹک کے لفافوں میں بند ہوتا تھا

---

[١] خالد لطیف گابا: مجبور آوازیں۔ تلخیص از ایم افضل بحوالہ روزنامہ نوائے وقت لاہور مورخہ ١٣ اگست ١٩٨٠ء۔

[٢] محمد حسن ایم۔اے، آپ بیتی، بحوالہ روزنامہ نوائے وقت ٢٢ اگست ١٩٨٠ء، مضمون "یہ لوگ کون ہیں ـــــ کیا چاہتے ہیں"۔ از ضیاء شاہد

نے اپنی رپورٹ ۱۸۵۸ء میں لکھا ——————

"موجودہ بغاوت کی تحریک (جنگ آزادی ۱۸۵۷ء) سکھوں اور ہندوؤں نے نہیں چلائی بلکہ اس تحریک کے چلانے والے اور اس کی انگیخت کرنے والے مسلمان ہیں اور مسلمانوں میں جاگیردار لوگ اور سرمایہ داروں نے یہ تحریک نہیں چلائی بلکہ غلامی کے خلاف بغاوت کے جذبات مسجدوں، خانقاہوں اور تعلیمی اداروں میں پائے جاتے ہیں"۔ ؎

مسٹر آرنلڈ کی 'تشخیص' کی روشنی میں میکالے نے مساجد اور خانقاہوں کے تعلیمی نظام کے مقابل جدید تعلیمی ادارے قائم کرنے کی سکیم پیش کی لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمانانِ ہند نے علماء و مشائخ کے زیر اثر ایک طویل عرصے تک ان تعلیمی اداروں کا مقاطعہ کیے رکھا جس سے ہندو نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور سرکاری دفاتر و کلیدی اسامیوں پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ انہی حقائق کا ادراک کرتے ہوئے سر سید احمد خان نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھی۔ جس کے کارکنوں کی سعی سے بعد میں مسلم لیگ وجود میں آئی

اس کے مقابلے میں دین پسند طبقے نے دینی تعلیمی ادارے قائم کرنے کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ انہی میں سے ایک دارالعلوم دیوبند بھی ہے گو اس درسگاہ کے قیام کے متعلق مؤرخین و محققین کی آراء مختلف ہیں اور

؎ ابو سعید قاسمی ۔ اسلامی تعلیمی پالیسی ایک نظر میں، صفحہ ۱۶

بعض تو کھلے لفظوں میں اسے انگریز کا "کارنامہ" قرار دیتے ہیں۔ لیکن ہمیں اسی حسنِ ظن سے کام لینا چاہیے کہ بانیانِ ادارہ پُرخلوص تھے۔ ممتاز محقق میاں عبدالرشید کی یہ رائے خاصا وزن رکھتی ہے۔

"دیوبند تحریک کے بانی میاں حاجی امداد اللہ ساری عمر مختلف اسلامی فرقوں کے اختلافات دُور کرنے میں کوشاں رہے۔ ان کا مسلک یہ تھا کہ نزاعی مسائل میں سے بیشتر میں نزاع محض لفظی ہے اور مقصد و متحد۔ مگر جیسا کہ اکثر ہوتا ہے بعد میں اس تحریک نے ایک الگ فرقہ کی حیثیت اختیار کر لی" [۱]

یہ تعلیمی ادارہ ——— دیوبند (بھارت) کے مقام پر ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ کو ایک مسجد میں قائم ہوا۔ اس مکتبِ فکر کے عقیدت مند اس مدرسہ کے قیام کو "الہامی" [۲] قرار دیتے ہیں اور اپنے اکابر کی بہت سی "کرامات" کا تذکرہ بھی کرتے ہیں جن کی تفصیل کا یہ مختصر کتابچہ متحمل نہیں ہو سکتا۔

دارالعلوم دیوبند کے قیام، اس کے اغراض و مقاصد یا بانیان کے خلاص و عدمِ اخلاص پر گفتگو ہمارا موضوع نہیں ہے۔ آئیے یہ دیکھیں کہ برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کے مختلف ادوار میں اس ادارہ سے منسلک حضرات کا اجتماعی کردار کیا رہا ہے۔ نیتوں کا حال تو اُس عالم الغیب کو ہے۔ تاریخ اپنے صفحات میں صرف عمل اور اس کے نتائج کو جگہ دیتی ہے۔

---

[۱] نوائے وقت لاہور، ۸ مئی ۱۹۷۰ء۔ مضمون "برطانوی دور میں برعظیم پاک و بھارت کی مسلم سیاست"

[۲] ماہنامہ "الرشید" فروری، مارچ ۱۹۷۶ء صفحہ ۱۲، ۲۵۸

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء

دارالعلوم دیوبند کا قیام جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے دس سال بعد عمل میں آیا۔ اس کے اکابر کا کردار اس معرکۂ حق و باطل میں کیا رہا یہ مولوی عاشق الٰہی میرٹھی کی زبانی سنیے۔

"شروع ۱۲۷۶ھ نبوی ۱۸۵۹ء وہ سال تھا جس میں حضرت امام ربانی[1] قدس سرہٗ پر اپنی سرکار سے باغی ہونے کا الزام لگایا گیا اور مفسدوں میں شریک رہنے کی تہمت باندھی گئی"۔[2]

مولوی عاشق الٰہی میرٹھی کا شمار اکابر علمائے دیوبند میں ہوتا ہے۔ وہ اپنے پیرو مرشد مولوی رشید احمد گنگوہی اور دوسرے قائدین دیوبند کی جنگِ آزادی میں شرکت کی پُرزور الفاظ میں تردید کرتے ہیں۔ بلکہ انگریز کی حمایت میں مجاہدین آزادی کے خلاف ان کی کارگزاریوں کا فخریہ تذکرہ کرتے ہیں۔ ایک واقعہ یوں لکھتے ہیں۔

"ایک مرتبہ ایسا بھی اتفاق ہوا کہ حضرت امام ربانی اپنے رفیقِ جانی مولانا قاسم العلوم اور طبیبِ روحانی اعلیٰ حضرت حاجی صاحب

---

[1] یعنی مولوی رشید احمد گنگوہی۔

[2] عاشق الٰہی میرٹھی : تذکرۃ الرشید مطبوعہ مکتبہ بحرالعلوم کراچی صفحہ ۷۲

و نیز حافظ ضامن صاحب کے ہمراہ تھے کہ بندوقچیوں سے مقابلہ ہو گیا۔ یہ نبرد آزما دلیر جتھا اپنی سرکار کے مخالف باغیوں کے سامنے سے بھاگنے یا ہٹ جانے والا نہ تھا۔ اس لیے اٹل پہاڑ کی طرح پرا جما کر ڈٹ گیا اور سرکار پر جان نثاری کے لیے طیار ہو گیا۔ اللہ رے شجاعت و جوانمردی کہ جس ہولناک منظر سے شیر کا پتہ پانی اور بہادر سے بہادر کا زہرہ آب ہو جائے وہاں چند فقیر ہاتھوں میں تلواریں لیے جمِّ غفیر بندوقچیوں کے سامنے ایسے جمے رہے گویا زمین نے پاؤں پکڑ لیے ہیں۔ چنانچہ آپ پر فیریں ہوئیں اور حضرت حافظ ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ زیرِ ناف گولی کھا کر شہید بھی ہوئے"۔ [۱]

مولوی ابو الزاہد سرفراز خان صاحب صفدر نے مذکورہ واقعہ کا حلیہ بگاڑ کر اسے اپنے بڑوں کی جنگِ آزادی میں عملی شرکت قرار دے دیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:۔

"آپ سمجھتے ہیں کہ کہاں جابر اور ظالم برطانیہ جو ملک پر برسرِ اقتدار تھا اور کہاں نہتے اور بے سرو سامان مجاہد؟ مگر ان بہادروں اور دلیروں نے اور ان میں خصوصیت کے ساتھ حضرت نانوتوی نے اپنی شجاعت کے خداداد جوہر اس جہادِ شاملی میں دکھائے۔ بالآخر ان حضرات کو شکست ہوئی، کچھ حضرات تو زخمی ہوئے اور حافظ محمد ضامن صاحب شہید ہو گئے"۔ [۲]

---

[۱] عاشق الٰہی میرٹھی: تذکرۃ الرشید مطبوعہ مکتبہ بحر العلوم کراچی صفحہ ۷۴، ۷۵

[۲] ماہنامہ الرشید، فروری، مارچ ۱۹۷۶ء صفحہ ۲۶۱

سرفراز صاحب صف در ہوں یا کوئی دوسرے "صف شکن" ——— وہ آج اپنے بزرگوں کی صفائی میں کتنے ہی ہاتھ پاؤں کیوں نہ ماریں۔ ان کے مقا... میں ان کے اکابر کی تحریریں ہی معتبر کہلائیں گی۔

بانیانِ دارالعلوم دیوبند انگریز کے دشمن تھے یا دوست؟ ——— بھی عاشق الٰہی میرٹھی کی زبان سے سنیئے کہ ———

ع مستند ہے اُن کا فرمایا ہُوا

"جب بغاوت و فساد کا قصہ فرو ہُوا اور رحم دل گورنمنٹ کی حکومت نے دوبارہ غلبہ پاکر باغیوں کی سرکوبی شروع کی تو جن بزدل مفسدوں کو ماسوائے اس کے اپنی رہائی کا کوئی چارہ نہ تھا کہ جھُوٹی سچی تہمتوں اور مخبری کے پیشہ سے سرکاری خیر خواہ اپنے کو ظاہر کریں۔ انہوں نے اپنا رنگ جمایا اور ان گوشہ نشین حضرات پر بھی بغاوت کا الزام لگایا۔" [1]

اسی کتاب میں آگے چل کر مولوی رشید احمد گنگوہی کے یہ الفاظ نق... کیے گئے ہیں جو انگریز سے وفاداری اور فرماں برداری کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

"...... میں جب حقیقت میں سرکار کا فرماں بردار ہوں تو جھُوٹے الزام سے میرا بال بھی بیکانہ ہوگا اور اگر مارا بھی گیا تو سرکار مالک ہے۔ اسے اختیار ہے جو چاہے کرے۔" [2]

آج تحریک آزادی کا 'ہیرو' بننے کے لیے تاریخ کی کیسی ہی گت ...

---

[1] عاشق الٰہی میرٹھی: تذکرۃ الرشید مطبوعہ مکتبہ بحرالعلوم کراچی صفحہ ۷۶

[2] 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ۸۰

نہ بنائی جائے۔ ان "اقبالی بیانات" کی موجودگی میں ایسی ہر کوشش شغلِ بیکار ہی کہلائے گی۔ ہم خوفِ طوالت سے مزید اقتباسات پیش کرنے سے دانستہ گریز کر رہے ہیں ورنہ صرف اسی ایک باب کے لیے کئی دفتر درکار ہیں۔

تحریکِ ختمِ نبوّت

دیوبندی مکتبِ فکر کے احباب کو تحریکِ ختمِ نبوت میں اپنے "کارناموں" پر بہت ناز ہے اور وہ اس کا ذکر تحریر ہو یا تقریر ہر کہیں بالالتزام کرتے ہیں چنانچہ تحفظِ ختمِ نبوت کے سلسلہ میں برصغیر پاک و ہند میں کی جانے والی ہر کوشش کو اپنے ہی کھاتے میں لکھتے ہیں۔ دلچسپ ترین بات یہ ہے کہ شخصیات تک کے "اغوا" کو مباح سمجھا گیا ہے۔

حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔ ذیل کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے کہ کس دیدہ دلیری سے حضرت کو دیوبندی صف میں لپیٹا جا رہا ہے۔

> حضرت پیر صاحبؒ حج پر تشریف لے گئے اور حجاز میں قیام کا ارادہ فرمایا، مگر حضرت قطبِ عالم حاجی صاحبؒ نے انہیں باصرار و تاکید ہندوستان کی واپسی کا مشورہ دیتے ہوئے فرمایا:۔
>
> "ہندوستان میں عنقریب ایک فتنہ رونما ہوگا، آپ وطن واپس جائیے۔ بالفرض آپ وہاں خاموش بھی بیٹھے رہیں تب

بھی وہ فتنہ ترقی نہیں کر سکے گا اور ملک میں سکون ہو جائیگا۔[1]

حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کو بوجوہ مختلف الخیال حلقوں میں احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے لیکن اس تحریر سے بالکل متصل یہ الفاظ بھی لکھے گئے ہیں۔

"قادیانی فتنہ کا جرثومہ ابھی رونما نہیں ہوا تھا کہ دارالعلوم دیوبند کے مرشد و مربی حضرت قطب العالم حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہٗ نے بطور کشف اس کے ظہور کی پیش گوئی فرمائی اور علمائے اُمت کو اس کی جانب متوجہ فرمایا۔[2]

گویا حاجی صاحب قبلہ دارالعلوم دیوبند کے مرشد و مربی ——— پیر مہر علی شاہ صاحب کا تعلق حاجی صاحب سے ——— اس طرح حضرت پیر صاحب کا قادیانیت کے خلاف سارا جہاد کھاتہ دیوبند میں ——— کیوں صاحب! ہے نا لاجواب اور دور کی کوڑی؟ ———

ماہنامہ الرشید لاہور کا دارالعلوم دیوبند نمبر (فروری، مارچ ۱۹۷۶ء) ہمارے سامنے ہے۔ جس میں مولوی محمد یوسف لدھیانوی صاحب کا ایک مضمون "دارالعلوم اور تحفظِ ختمِ نبوت" کے زیرِ عنوان ۴۵ صفحات پر محیط ہے۔ اس مضمون میں تحریکِ ختمِ نبوت کا سارا کریڈٹ دیوبند کو دلانے کی سعیِ ناکام کی گئی ہے۔ چنانچہ جہاں بانیِ دارالعلوم سے لے کر یوسف بنوری صاحب

---

[1] ماہنامہ الرشید لاہور، فروری۔ مارچ ۱۹۷۶ء صفحہ ۶۷۲، ۶۷۳

[2] 〃 〃 〃 〃 〃 ۶۷۳

یک، سب کو اس تحریک کا مجاہد بتایا گیا ہے وہاں بدنام زمانہ کتاب "تحذیرالناس" کی مذموم عبارات کی تاویلیں بھی کی گئی ہیں لیکن آخر اس کتاب کے یہ صفحات کہاں نوچ پھینکے جائیں گے۔

"عوام کے خیال میں تو رسول اللہ صلعم کا خاتم ہونا بایں معنیٰ ہے کہ آپ کا زمانہ انبیاء سابق کے زمانے کے بعد اور آپ سب میں آخر نبی ہیں۔ مگر اہلِ فہم پر روشن ہوگا کہ تقدیم یا تاخیر زمانی میں بالذات کچھ فضیلت نہیں۔ پھر مقام مدح میں وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ فرمانا اس صورت میں کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے" [۱]

اور

"اگر بالفرض بعد زمانہ نبوی صلعم بھی کوئی نبی پیدا ہو تو خاتمیت محمدی میں کچھ فرق نہ آئے گا" [۲]

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ تحذیر الناس کے بعد کے اڈیشنوں میں اس عبارت کو یوں بدل دیا گیا۔

"اگر بالفرض آپ کے زمانہ میں یا بالفرض آپ کے بعد بھی کوئی نبی فرض کیا جائے تو بھی خاتمیت محمدی میں فرق نہ آئے گا" [۳]

اس قسم کے فتاویٰ نے ہی مرزا غلام احمد قادیانی کو یہ جرأت دلائی ہوگی کہ اس نے دعویٰ نبوت کر ڈالا۔ واقعات کی تاریخ وار ترتیب کو ذہن نشین

---

[۱] مولوی محمد قاسم نانوتوی، تحذیرالناس مطبوعہ قاسمی پریس، دیوبند صفحہ ۳

[۲] 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ۲۸

[۳] 〃 〃 〃 〃 مکتبہ راشد کمپنی دیوبند صفحہ ۲۲

کرنے کے لیے شاید یہ الفاظ کافی ہوں ۔

"قادیانی نبوت کا فتنہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحؒ (۱۲۹۷ھ) بانیٔ دارالعلوم دیوبند کے وصال کے بعد رونما ہوا" ۔[1]

قاسمی صاحب نے رسالہ تحذیر الناس ۱۸۷۳ء میں لکھا جب کہ مرزا قادیانی نے اپنے ملہم اور مجدد ہونے کا دعویٰ ۱۸۸۰ء میں کیا ۔

آنجہانی مرزا صاحب اور ان کے چیلے چانٹے اِن فتاویٰ کو اپنے دعویٰ کے حق میں بطورِ دلیل پیش کرتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں ۔ چنانچہ مرزا کے خلیفہ مرزا بشیر احمد نے مولوی محمد قاسم نانوتوی کے اسی رسالہ "تحذیر الناس" کی ایک عبارت نقل کر کے لکھا ہے ۔

"اہلِ بصیرت کے نزدیک اس شہادت کو خاص منزلت حاصل ہونا چاہیے ۔ یہ شہادت مدرسۃ العلوم دیوبند کے نامور بانی حضرت مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی رف ۱۸۸۹ء، کی ہے ۔"[2]

اب ذرا لگے ہاتھوں اس مکتبِ فکر کے حکیم الامت جناب اشرف علی تھانوی کے متعلق ایک واقعہ بھی سن لیجیے ۔ جس کے راوی تحریکِ پاکستان کے ممتاز رکن اخبار زمیندار کے مدیر مولانا ظفر علی خان مرحوم ہیں ۔

"تھانہ بھون (ضلع مظفر گڑھ[3]) نے قادیان کے اس تین شین کی

---

[1] ماہنامہ الرشید لاہور، فروری ۔ مارچ ۱۹۷۶ء ، صفحہ ۷۶

[2] ختم نبوت کی حقیقت ، مطبوعہ کراچی صفحہ ۴ د ۔

[3] یہ مظفر نگر ہونا چاہیے ۔

شرح کی ہے اور عملی شرح کی ہے۔ سجادہ نشین امدادیہ حضرت مولانا حاجی حافظ شاہ اشرف علی صاحب تھانوی کا ایک ماہانہ صوفیانہ رسالہ شائع ہوتا ہے جس کا نام "الامداد" ہے۔ ماہ صفر ۱۳۳۶ھ کے "الامداد" میں مریدوں کے سوالات اور جناب پیر و مرشد کے جوابات درج ہیں۔ صفحہ نمبر ۳۴، ۳۵ پر ایک مرید نے ایک سوال کیا ہے جو سلسلہ ترتیبی میں تیسرے نمبر پر واقع ہے۔ یعنی دو سوال اور ان کے جواب اس سے پہلے بھی آچکے ہیں۔ اس تیسرے سوال کی عبارت سراپا بشارت ملاحظہ ہو۔ [1]

"ایک دفعہ ریاست رام پور میں جانے کا اتفاق ہوا وہاں ایک مسجد میں ایک مولوی صاحب کے ہاں ٹھہرنا پڑا۔ جو طالب علم تھے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ مولوی صاحب حضور سے (یعنی مولانا شاہ اشرف علی صاحب سے) بیعت ہیں۔ اس لیے ان سے اور بھی محبت ہو گئی۔ اثنائے گفتگو میں معلوم ہوا کہ ان کے پاس دو رسالے "الامداد" "حسن العزیز" ماہوار آتے ہیں۔ بندہ نے ان کے دیکھنے کے واسطے درخواست کی۔ مولوی صاحب (طالب علم) نے چند رسالے مجھ کو دیکھنے کے واسطے دیئے۔ الحمد للہ جو لطف ان سے اٹھایا، بیان سے باہر ہے۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ حسن العزیز دیکھ رہا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا کہ نیند کا غلبہ ہوا۔ سو جانے کا ارادہ کیا۔ رسالہ حسن العزیز کو ایک طرف

---

[1] مولانا ظفر علی خان: نقشۂ غیب۔ قادیان تھانہ بھون میں، صفحہ ۶

رکھ دیا لیکن جب بندہ نے دوسری کروٹ بدلی تو دل میں خیال
آیا کہ کتاب کو پشت ہو گئی اس لیے رسالہ حسن العزیز کو اٹھا کر
اپنے سر کی جانب رکھ لیا۔ اور سو گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد خواب
دیکھتا ہوں کہ کلمہ شریف لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ
پڑھتا ہوں لیکن محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جگہ حضور
کا نام لیتا ہوں۔ (یعنی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اشرف علی رسول اللہ)
اتنے میں دل میں خیال پیدا ہوا کہ کلمہ شریف کے پڑھنے میں مجھ سے
غلطی ہوئی۔ اس کو صحیح پڑھنا چاہیئے۔ اس خیال سے دوبارہ کلمہ
شریف پڑھتا ہوں۔ دل میں تو یہ ہے کہ صحیح پڑھا جائے لیکن زبان
سے بے ساختہ بجائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے
اشرف علی نکل جاتا ہے۔ حالانکہ مجھ کو اس بات کا علم ہے
کہ اس طرح درست نہیں لیکن بے اختیار زبان سے یہی
کلمہ نکلتا ہے۔ دو تین بار جب یہی صورت ہوئی تو حضور کو
اپنے سامنے دیکھتا ہوں۔ اور بھی چند شخص حضور کے پاس تھے
لیکن اتنے میں میری یہ حالت ہو گئی کہ میں کھڑا کھڑا بوجہ اس کے
کہ رقت طاری ہو گئی تھی زمین پر گر گیا اور نہایت زور کے ساتھ
چیخ ماری۔ مجھ کو معلوم ہوتا تھا کہ میرے اندر کوئی طاقت باقی نہیں
رہی۔ اتنے میں بندہ خواب سے بیدار ہو گیا لیکن بدن میں بدستور
بے حسی تھی اور وہ اثر ناطاقتی بدستور تھا۔ حالتِ خواب و بیداری
میں کلمہ شریف کی غلطی پر جب خیال آیا تو اس بات کا ارادہ ہوا
کہ اس خیال کو دل سے دور کیا جائے۔ اس واسطے کہ پھر

کوئی ایسی غلطی نہ ہو جائے ۔ ہاں خیال بندہ بیٹھ گیا۔ پھر دوسری کروٹ لیٹ کر کلمہ شریف کی غلطی کے تدارک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھتا ہوں لیکن پھر بھی یہ کہتا ہوں کہ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَنَبِیِّنَا وَمَوْلَانَا اشرف علی حالانکہ اب میں بیدار ہوں ۔ خواب نہیں لیکن بے اختیار ہوں مجبور ہوں ۔ زبان اپنے قابو میں نہیں ۔ اس روز ایسا ہی کچھ خیال رہا ۔ دوسرے روز بیداری میں رقت رہی ۔ خوب رویا اور بھی بہت سی وجوہات ہیں ۔ جو حضور کے ساتھ محبت کا باعث ہیں ۔ کہاں تک عرض کروں ۔

حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحب اس کے جواب میں صرف ایک فقرہ پر قناعت فرماتے ہیں ۔ "اس واقعہ میں تسلی تھی کہ تم جس کی طرف رجوع کرتے ہو وہ بعونہ متبع سنت ہے ۔"

الامداد کا رسالہ ہماری نظر سے نہیں گزرا ہے اور نہ ہم نے اسے پڑھا ہے ۔ ہمارا اخذ اہلِ حدیث امرتسر ہے جس نے ۲۵ رجنوری ۱۹۱۸ء کی اشاعت میں اس سوال و جواب کو بعنوان " مریدانہ محبت یا مالیخولیا"۔ شائع کر دیا ہے ۔ " النقل کالاصل" لکھ کے اس کی توثیق بھی کی ہے ۔ اگر یہ سوال و جواب صحیح ہے اور بظاہر اس کو صحیح نہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں تو کیا اسلام کے لیے یہ ایک " عجیب و غریب فتنہ " نہیں ہے ۔ جسے " الامداد " نے سوتے سے بیدار کیا ہے :

یہ فتوے خود حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحب دیں گے
کہ فتنہ کو بیدار کرنے والے کی نسبت حدیثِ نبوی میں کیا
حکم ہے۔ ؎

مولانا ظفر علی خاں مرحوم کے سامنے الامداد رسالہ نہیں تھا لیکن ہم اس رسالہ کے صفحہ ۴۵ کا عکس شائع کر رہے ہیں۔ تبصرہ ——— وتمیز حق و باطل کا فریضہ ہم قارئین پر چھوڑتے ہیں۔

مولوی قاسم نانوتوی صاحب کے "علمی فتویٰ" اور مولوی اشرف علی صاحب تھانوی کے "عملی کارنامہ" کے بعد بھی اس قبیلے سے متعلق افراد کا ختمِ نبوت کے سلسلہ میں اپنی اور اپنے اکابر کی "خدمات" پر اصرار یقیناً قابلِ داد ہے۔

؎ مولانا ظفر علی خان ایڈیٹر روزنامہ زمیندار' ستارہ صبح : فتنۂ عجیب' قادیان تھانہ بھون میں۔ صفحہ ۱۸

اور سو گیا کچھ عرصہ کے بعد خواب دیکھتا ہوں کہ کلمہ شریف لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھتا ہوں لیکن محمد رسول اللہ کی جگہ حضور کا نام لیتا ہوں اتنے میں دل کے اندر خیال پیدا ہوا کہ مجھ سے غلطی ہوئی کلمہ شریف کے پڑھنے میں اسکو صحیح پڑھنا چاہئے اس خیال سے دوبارہ کلمہ شریف پڑھتا ہوں دل پر تو یہ ہے کہ صحیح پڑھا جاوے لیکن زبان سے بے ساختہ بجائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے اشرف علی نکل جاتا ہے حالانکہ مجھکو اس بات کا علم ہے کہ اس طرح درست نہیں لیکن بے اختیار زبان سے یہی کلمہ نکلتا ہے۔ دو تین بار جب یہی صورت ہوئی تو حضور کو اپنے سامنے دیکھتا ہوں اور بھی چند شخص حضور کے پاس تھے لیکن اتنے میں میری یہ حالت ہو گئی کہ میں کھڑا کھڑا بوجہ اس کے کہ رقت طاری ہو گئی زمین پر گر گیا اور نہایت زور کے ساتھ ایک چیخ ماری اور مجھکو معلوم ہوتا تھا کہ میرے اندر کوئی طاقت باقی نہیں رہی اتنے میں بندہ خواب سے بیدار ہو گیا لیکن بدن میں بدستور بے حسی تھی اور وہ اثر ناطاقتی بدستور تھا لیکن حالت خواب اور بیداری میں حضور کا ہی خیال تھا لیکن حالت بیداری میں کلمہ شریف کی غلطی پر جب خیال آیا تو اس بات کا ارادہ ہوا کہ اس خیال کو دل سے دور کیا جاوے اس واسطے کہ پھر کوئی ایسی غلطی نہ ہو جاوے بایں خیال بندہ بیٹھ گیا اور پھر دوسری کروٹ لیٹ کر کلمہ شریف کی غلطی کے تدارک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھتا ہوں لیکن پھر بھی یہ کہتا ہوں اللہم صل علی سیدنا ونبینا ومولانا اشرف علی حالانکہ اب بیدار ہوں خواب نہیں لیکن بے اختیار ہوں مجبور ہوں زبان اپنے قابو میں نہیں اس روز ایسا ہی کچھ خیال رہا تو دوسرے روز بعد بیداری میں رقت رہی خوب رویا اور بھی بہت سے وجوہات ہیں جو حضور کے ساتھ باعث محبت ہیں کہاں تک عرض کروں۔

جواب اس واقعہ میں تسلی تھی کہ جس کی طرف تم رجوع کرتے ہو وہ بعونہ تعالیٰ متبع سنت ہے۔
۲۴ شوال ۱۳۳۵ھ۔

رسالہ "الامداد" صفحہ ۳۵ کا عکس تحریر

تحریکِ خلافت و ترکِ موالات

تحریکِ ہجرت کے نتیجہ میں مسلمانوں نے بے پناہ نقصان اُٹھایا ـــــ ان کی جائدادیں اور اثاثے ہندوؤں نے کوڑیوں کے مول خریدے اور خود مسلمان افغانستان پہنچ کر بلکہ زیادہ تر دورانِ سفر ہی تباہ و برباد ہو گئے۔

زخم خوردہ مسلمانانِ ہند کے لیے پہلی جنگِ عظیم کے خاتمہ اور خلافت کی تباہی کے بعد انگریزوں کی طرف سے ترکوں پر ظلم و استبداد محض کو چنگاری دکھانے کے مترادف تھا۔ مسلمانوں کے اس جذباتی ہیجان سے مسٹر گاندھی نے بھرپور فائدہ اُٹھایا۔ چنانچہ جب اواخر نومبر ۱۹۱۹ء میں آل انڈیا خلافت کانفرنس کا پہلا اجلاس دہلی میں ہوا تو ایک نشست کی صدارت مسٹر گاندھی نے بھی کی۔

اس میں شک نہیں کہ تحریک خلافت کا ذکر آتے ہی ذہن علی برادران کی طرف چلا جاتا ہے اور بالخصوص مولانا محمد علی جوہر اور تحریک خلافت تو ایک ہی شے کے دو نام معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اس تحریک سے ہندو نے پورا پورا فائدہ اُٹھایا اور صرف ایک سال کے

قلیل عرصہ میں ہی مسٹر گاندھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترکہ قائد بن کر سامنے آئے اور کانگریس جس کے ارکان کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی ــــــــ میں مسلمان دھڑا دھڑ شامل ہونے لگے۔

مسٹر گاندھی نے تحریک خلافت میں کامیابی کے بعد اب اگلا وار کیا اور ۱۹۲۰ء میں تحریک ترک موالات کا اعلان کیا۔ الہ آباد میں ہندو اور مسلمان رہنماؤں کا ایک مشترکہ اجلاس تھا۔ جس میں ترک موالات کی قرار داد منظور کر لی گئی اور لائحہ عمل مکمل طور پر مسٹر گاندھی کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا۔

دار العلوم دیوبند کے شیخ الہند مولوی محمود حسن، مفتی محمد کفایت اللہ نے انگریزوں سے موالات کو حرام اور ترک موالات کو مذہبی فریضہ قرار دیا۔ مفتی محمد شفیع مرحوم اور مولوی احمد سعید مرحوم نے بھی اس کی تائید کی اور مولوی عبد الباری فرنگی محلی نے بھی اس سے پورا پورا اتفاق کیا۔[۱]

ترک موالات سے شاید کسی کو اس قدر اختلاف نہ ہوتا لیکن اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ہندو مسلم موالات جو دراصل مسٹر گاندھی کا مقصود و مطلوب تھی۔ بیدار علمائے دین کے نزدیک مسلمانوں کے لیے سم قاتل سے کم نہ تھی۔

یہ حضرات بجا طور پر اس ہندو مسلم اتحاد کے خلاف تھے جو وطنیت پرستی اور دین سے بے خبری پر مبنی تھا۔ کانگریس تو چاہتی ہی یہ تھی کہ رہی

۱؎ ارکان مجلس خلافت، تحریک عدم تعاون اور احکام دین مبین، مجلس خلافت پنجاب لاہور، ۸ر نومبر ۱۹۲۰ء صفحہ ۹، ۱۰، ۱۲

امتیازات کو یکسر بھلا کر "ہندوستانیت" کا پرچم تھام لیا جائے اور یوں مسلمانوں کا علیحدہ وجود ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔

یہ دیکھ کر حد درجہ حیرت اور دُکھ ہوتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی مسندِ افتا سے یکے بعد دیگرے اس قسم کے فتووں کی بوچھاڑ ہوتی رہی ہے جو مسلمانوں کے ملی تشخص کو مٹانے اور ہندوستانیت میں ضم کرنے کی سازش میں دانستہ یا نا دانستہ طور پر ممد و معاون ثابت ہوتے رہے۔

مولوی محمود حسن صاحب (شیخ الہند، اسیر مالٹا) فرماتے ہیں۔

"اس لیے ہندوستان کی آبادی کے یہ دونوں (ہندو مسلمان) بلکہ سکھوں کی جنگ آزما قوم کو ملا کر تینوں عنصر اگر صلح و آشتی سے رہیں گے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی چوتھی قوم خواہ وہ کتنی ہی بڑی طاقت ور ہو ان اقوام کی اجتماعی قوت کو شکست دے سکے گی۔" [1]

انہی محمود حسن صاحب کا یہ ارشاد بھی قابلِ توجہ ہے۔

"کچھ شبہ نہیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے آپ کے ہم وطن اور ہندوستان کی سب سے زیادہ کثیر التعداد قوم (ہنود) کو کسی نہ کسی طریق سے آپ کے ایسے پاک مقصد کے حصول کے لیے مؤید بنا دیا ہے اور میں ان دونوں قوموں (ہنود و مسلمان) کے اتفاق و اتحاد کو بہت مفید اور منتج سمجھتا ہوں اور حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے جو کوشش اس کے لیے فریقین کے عمائد نے کی ہے اور

---

[1] سید محمد میاں: علمائے حق حصہ اول مطبوعہ مراد آباد ۱۹۴۶ء صفحہ ۲۱۷

کر رہے ہیں - اس کے لیے میرے دِل میں بہت قدر ہے۔[1]

بعض حضرات کا خیال ہے کہ مولانا محمود حسن صاحب "ریشمی خط" والی تحریک کی ناکامی اور اسارتِ مالٹا کے بعد ہندو مسلم اتحاد کے داعی بنے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مجوزہ آزاد حکومت کے قیام کے سلسلہ میں مولانا موصوف کی مساعی کو شواہد کی کسوٹی پر پرکھیں تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ یہ حکومت بھی خالص لادینی اور اسی ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد پر قائم ہوتی -

یہ بات کیا نظر انداز کر دینے کے قابل ہے کہ مولوی محمود حسن صاحب مولانا عبیداللہ سندھی کو کابل بھیجتے ہیں جہاں انہی کے حکم اور مشورے سے "موقتہ ہند" کے نام سے ایک متوازی حکومت بنائی جاتی ہے جس کے تاحیات صدر (LIFE PRESIDENT) معروف متعصب سکھ لیڈر راجہ مہندر پرتاپ[2] مقرر ہوتے ہیں - اور اُن کی قیادت میں مولانا عبیداللہ سندھی وزارتِ خارجہ کا قلمدان سنبھالتے ہیں اور اپنی اس حکومت کا پالیسی بیان یوں ارشاد فرماتے ہیں :-

> "مرکزی حکومتِ ہند (CENTRAL GOVT OF THE FEDERAL REPUBLIC OF INDIA) کا مذہب سے کوئی تعلق نہ ہوگا اور نہ اس کو ان مذاہب میں دخل دینے کا حق حاصل ہوگا جو پارٹی کے مندرجہ بالا اقتصادی اور اجتماعی اصولوں کو مانتے ہیں -"[3]

---

[1] سید محمد میاں : علمائے حق حصہ اول مطبوعہ مراد آباد ۱۹۴۶ء ، صفحہ ۹۶

[2] آپ بیتی ظفر حسن ایبک ، طبع منصور بک ہاؤس لاہور ، صفحہ ۱۰۰

[3] مولانا سندھی : پمفلٹ جمنا نربدا سندھ ساگر پارٹی ، شائع کردہ بیت الحکمتہ دہلی

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

راجہ مہندر پرتاپ اور مولانا عبیداللہ سندھی کے ایک رفیق کار مسٹر ظفر حسن ایبک کا یہ تبصرہ کسی مزید تبصرہ کا محتاج نہیں ہے۔

"راجہ مہندر پرتاپ ہندوستان کے آزاد ہونے پر وہاں ایک ہندو حکومت قائم کرنا چاہتے تھے"۔ [۱]

اس سے بھی بہت پہلے سید احمد بریلوی نے "اسلامی حکومت" کے قیام کے لیے جو "جہاد" کیا، ایک نظر اس پر بھی ڈالتے چلیں تو بعد میں آنے والے ان کے پیروکاروں کی طرف سے ہندو مسلم اتحاد کے لیے تن، من، دھن لگا دینا بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے۔ موصوف جس قسم کی "اسلامی حکومت" قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس کا ناک نقشہ ان کے روحانی جانشین مولوی حسین احمد مدنی کی زبانی سنیے۔

"سید صاحب کا مقصد چونکہ ہندوستان سے انگریزی تسلط و اقتدار کا قلع قمع کرنا تھا جس کے باعث ہندو اور مسلمان دونوں ہی پریشان تھے، اس بنا پر ــــــ آپ نے اپنے ساتھ ہندوؤں کو بھی شرکت کی دعوت دی اور اس میں صاف صاف انہیں بتایا کہ آپ کا واحد مقصد ملک سے پردیسی لوگوں کا اقتدار ختم کر دینا ہے۔ اس کے بعد حکومت کس کی ہوگی، اس سے آپ کو غرض نہیں، جو لوگ حکومت کے اہل ہوں گے، ہندو یا

(بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۲۷) صفحہ ۵۰، بحوالہ "مولانا عبیداللہ سندھی" از پروفیسر محمد سرور، سندھ ساگر اکادمی صفحہ ۵۸۰

[۱] آپ بیتی ظفر حسن ایبک طبع منصور بک ہاؤس لاہور، صفحہ ۹

یا مسلمان یا دونوں ، حکومت کریں گے ۔ چنانچہ اس سلسلے میں سرحدِ ریاست گوالیار کے مدارالمہام اور مہاراج دولت رائے سندھیا کے وزیر و برادرِ نسبتی راجہ ہندو راؤ کو آپ نے جو خط تحریر فرمایا ہے وہ غور سے پڑھنے کے قابل ہے' اس سے آپ کے اصل عزائم اور ملکی حکومت کے متعلق آپ کے نقطۂ نظر پر روشنی پڑتی ہے "۔ ؎۱

انگریزوں کے خلاف جدوجہد کی تردید بھی اسی سانس میں مولوی حسین احمد مدنی نے بدیں الفاظ فرما دی کہ سند رہے ۔

' جب سید صاحب کا ارادہ سکھوں سے جنگ کرنے کا ہوا تو انگریزوں نے اطمینان کا سانس لیا اور جنگی ضرورتوں کے مہیا کرنے میں سید صاحب کی مدد کی "۔ ؎۲

▼

ہندو مسلم اتحاد کا یہ سیلاب کیا کچھ بہا لے گیا اور اپنے پیچھے کیا چھوڑ گیا۔ اس کا اندازہ ان ثمرات سے لگایا جا سکتا ہے جو اب تاریخ کا حصہ ہیں ۔ مثلاً :۔

- ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے ترکِ گاؤ کشی کی تحریک چلی ۔
- مساجد میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترکہ اجتماعات ہوئے جہاں ہندو لیڈروں نے تقریریں کیں اور بعض جلسوں کی صدارت بھی کی ۔
- ہندو لیڈروں کی موت پر دعا و فاتحہ کے لیے اشتہارات تقسیم ہوئے ۔

؎۱ حسین احمد مدنی ؛ نقشِ حیات جلد دوم مطبوعہ دہلی ۱۹۵۴ء صفحہ ۱۳

؎۲ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۲ ، ۱۳

اور مسلمان "قائدین" نے ان کی ارتھیوں کو کندھے دیئے۔

- مسلمان ہندوؤں کی مذہبی تقریبات میں شریک ہوئے، سنکھ بجائے اور مورتیوں پر پھول چڑھائے۔
- ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر رامائن، بائبل اور قرآن مجید کو ایک سنگھاسن میں رکھ کر بھجن گاتے، جھانجھ بجاتے، جلوس کی شکل میں مندر میں لے جاکر رکھا۔
- وید کو الہامی کتاب اور کرشن جی کو حضرت موسٰی علیہ السلام کا لقب مان لیا گیا۔
- یہاں تک کہا گیا کہ اگر نبوت ختم نہ ہوتی تو گاندھی جی نبی ہوتے۔

لیکن اس کے باوجود

- مسلمانوں کا علیحدہ وجود بالکلیہ ختم کرنے کے لیے ہندوؤں کی طرف سے شدھی کی تحریک شروع ہوئی۔

تحریکِ پاکستان

مسٹر گاندھی نے بزعم خویش میدان مار لیا تھا اور مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو "متحدہ قومیت" کا حامی بنا لیا تھا اب وہ خود کو ہندوستان کا واحد اور غیر متنازعہ لیڈر سمجھتے تھے لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ہندوؤں اور

مسلمانوں کے غیر فطری اتحاد کا یہ طلسم زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔

چنانچہ جب دارالعلوم دیوبند سے متحدہ قومیت کے حق میں آواز بلند ہوئی اور مولوی حسین احمد صاحب نے قرآن و حدیث کی من مانی تاویلات بلکہ تحریفات کرکے یہ فتویٰ داغا کہ ــــــــ

"اس زمانہ میں قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں، مذہب سے نہیں بنتیں۔"[1]

تو حکیم الامت حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے بسترِ مرگ سے گرفت فرماتے ہوئے یہ تاریخی اشعار کہے۔

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست
سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن ست
چہ بے خبر ز مقام محمد عربی ست
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی ست[2]

علامہ مرحوم کی زندگی میں تو مولوی حسین احمد صاحب مصلحتاً منقار زیر پر رہے لیکن بعد میں انہوں نے اپنے نظریہ کی توضیح ان الفاظ میں فرمائی :-

۱- موجودہ زمانہ میں قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں نہ کہ نسل اور

---

[1] مولانا تازی، مدیر مجلہ طلوع اسلام دہلی : متحدہ قومیت اور اسلام مطبوعہ دفتر اشاعت سیرت، مصری شاہ لاہور، صفحہ ۲

[2] علامہ محمد اقبال : ارمغانِ حجاز صفحہ ۲۷۸

مذہب ہے۔

۲۔ قوم کا اطلاق ایسی جماعت پر کیا جاتا ہے جس میں کوئی وجہ جامعیت ہو خواہ وہ مذہب ہو یا وطنیت یا نسل یا پیشہ یا رنگت یا کوئی اور صفت معنوی یا مادی وغیرہ

۳۔ یہ دعویٰ کہ اسلام کی تعلیم، قومیت کی بنیاد۔ جغرافیائی حدود یا نسلی وحدت یا رنگ کی یکسانی کے بجائے شرف انسانی اور اخوت بشری پر رکھتی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ کون سی نص قطعی یا ظنی سے ثابت ہے"۔ ؎

اور یہ ایک مولوی حسین احمد مدنی پر ہی کیا موقوف ہے۔ دارالعلوم دیوبند نے بحیثیت اجتماعی کانگریس کے لیے دست و بازو کا کام دیا اور جن گنے چنے حضرات (مولانا اشرف علی تھانوی و مولانا شبیر احمد عثمانی وغیرہم) نے اس موقف سے اختلاف کیا۔ انہیں اس "عظیم درسگاہ" کے سپوتوں نے گالیوں سے نوازا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی کے اپنے الفاظ ہیں۔

" دارالعلوم دیوبند کے طلباء نے جو گندی گالیاں اور فحش اشتہارات اور کارٹون ہمارے متعلق چسپاں کیے، جن میں ہم کو ابوجہل تک

؎ مولانا رازی، مدیر مجلہ طلوع اسلام دہلی؛ متحدہ قومیت اور اسلام مطبوعہ دفتر اشاعت سیرت، مصری شاہ لاہور صفحہ ۲

نوٹ: مولوی حسین احمد کے رجوع اور علامہ مرحوم کے ان اشعار کا "ارمغان حجاز" سے حذف کرنا کا افسانہ تراشنے والوں کو ان تحریروں کو بھی ایک نظر دیکھ لینا چاہیے تھا۔

(رجا دید)

کیا گیا اور ہمارا جنازہ نکالا گیا ۔ آپ حضرات نے اس کا بھی کوئی تدارک کیا تھا ؟ آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت دارالعلوم کے تمام مدرسین، مہتمم اور مفتی سمیت (باستثناء ایک دو کے) بالواسطہ یا بلاواسطہ مجھ سے نسبتِ تلمذ رکھتے تھے"۔ ؎

مولوی شبیر احمد عثمانی دارالعلوم دیوبند پر کانگریسی غلبہ پر اپنے دکھ کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں ۔

"حضرت مولانا انور شاہ کے عہدِ مبارک تک دارالعلوم ہر قسم کے داخلی اور خارجی فتنوں سے پاک وصاف تھا ۔ درسِ حدیث میں خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے بجائے مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو کی اطاعت کا درس نہیں دیا جاتا تھا ——— اب تفسیر جلالین بیضاوی اور درسِ حدیث میں کانگریسیت کا

؎ مکالمۃ الصدرین مطبوعہ دارالاشاعت دیوبند صفحہ ۲۱

نوٹ : مکالمۃ الصدرین ——— جمیعۃ العلمائے ہند کے صدر مولوی حسین احمد مدنی اور جمیعت العلمائے اسلام کے صدر مولوی شبیر احمد عثمانی کے درمیان اس گفتگو کا ریکارڈ ہے جو ۷ دسمبر ۱۹۴۵ء کو عثمانی صاحب کے دولت کدہ پر ہوئی ۔ اس میں مندرجہ ذیل اکابر علمائے دیوبند نے مولوی شبیر احمد عثمانی کو تحریکِ پاکستان کی حمایت سے دست کش ہونے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی ۔

۱۔ مولوی حسین احمد (صدر جمیعت العلمائے ہند)، ۲۔ مفتی کفایت اللہ (سابق صدر جمیعت العلمائے ہند)، ۳۔ مولوی احمد سعید (سابق ناظم اعلیٰ جمیعت العلمائے ہند) ۴۔ مولوی حفیظ الرحمٰن (ناظم اعلیٰ جمیعت العلمائے ہند)، ۵۔ مولوی عبدالحلیم صدیقی ۶۔ مولوی عبدالحنان، ۷۔ مفتی عتیق الرحمٰن ۔

سبق پڑھایا جانے لگا ۔ مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو کے کارناموں کی نہ صرف تعریف کی جاتی ہے بلکہ اُن کی تائید قرآن و حدیث سے پیش کی جانے لگی ۔ درسِ حدیث میں شاید ہی کوئی دن ایسا گذرتا ہوگا کہ جس میں کانگریس کا تذکرہ اور اس میں شمولیت کی تلقین نہ کی جاتی ہو ۔ ان ہی کی تقریروں اور ہدایات دن کی متواتر کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج دارالعلوم نہ صرف ہنود کا مداح ہے بلکہ اُن کے رنگ میں بہت کچھ رنگا جا چکا ہے "۔ ؎

اب عثمانی صاحب کے اسی بیان کا ایک اور حصہ ملاحظہ فرمائیں جس میں نہ صرف دارالعلوم دیوبند اور کانگریس کے یک جان دو قالب ہونے پر رنج کا اظہار کیا گیا ہے بلکہ اس دینی درسگاہ کے طلباء کی غیر اسلامی اور غیر شرعی حرکات کا نوٹس بھی لیا گیا ہے ۔

" افسوس ! وہ دارالعلوم جس کی بنیاد اولیاء و اکابرین نے اسلامی تعلیم اور اس کی روایات کے بقاء و تحفظ کے لیے رکھی تھی ۔ آج کانگریسیوں کا ایک مستحکم قلعہ بنا ہوا ہے جس میں ایک ریزرو فوج کافی تعداد میں ہر وقت جمع رہتی ہے ۔ دارالعلوم کے فرزندوں کو جہاں کانگریسی حکومت کے شوق نے ملکی آزادی کا پروانہ دے دیا ہے اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے دین سے آزادی حاصل کرنی بھی شروع کر دی ہے ۔ آج بہت سے ایسے طلباء موجود ہیں جو محرمات

؎ بیان مولانا شبیر احمد عثمانی مطبوعہ اخبار وحدت دہلی مورخہ ۲۲ ر دسمبر، ۱۹۳۸ء بحوالہ اخبار دبدبہ سکندری رام پور ۵ ر نومبر ۱۹۴۵ء

شرعیہ اور منکرات میں اس درجہ مبتلا ہیں کہ شاید کسی ہندو کالج میں یہ بات نہ ہو۔" [1]

عثمانی صاحب کے علاوہ مولوی اشرف علی تھانوی بھی مدرسہ دیوبند پر کانگریسی سیاست کے اثراتِ بد پر بہت نالاں تھے۔ ایک دیوبندی قلم کار پروفیسر احمد سعید کے الفاظ میں۔

"چنانچہ جس وقت مولانا حسین احمد صاحب دیوبند کے صدر مدرس مقرر کیے گئے اس کے بعد انہوں نے سیاست میں بہت سرگرمی سے حصہ لینا شروع کیا۔ مولانا تھانوی کانگرسی سیاست کے سخت مخالف تھے۔ چنانچہ جب ان کو معلوم ہوا کہ مدرسہ میں بھی سیاست آگئی ہے تو آپ نے فیصلہ کیا کہ اپنے آپ کو دارالعلوم کی سرپرستی سے علیحدہ کر لیں۔" [2]

مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی مولوی اشرف علی صاحب تھانوی کی دارالعلوم دیوبند کی سرپرستی سے علیحدگی کی وجہ بیان کرتے ہوئے اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں۔

"حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے استعفیٰ از سرپرستی دارالعلوم

---

[1] بیان مولانا شبیر احمد عثمانی مطبوعہ اخبار وحدت دھلی مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۹۴۷ء بحوالہ اخبار دبدبہ سکندری، رام پور مطبوعہ ۵ نومبر ۱۹۴۵ء

[2] پروفیسر احمد سعید: مولانا اشرف علی تھانوی اور تحریک آزادی: مطبوعہ راولپنڈی کراچی صفحہ ۱۲۰

کی بڑی وجہ دو تھیں۔ اوّل تو حضرت کسی تعلیم گاہ کے طلباء و مدرسین کو ملک کی عملی سیاست میں حصّہ لینا اصولاً پسند نہ تھا۔ خصوصاً کانگرسی سیاست، جس میں ایک طرف تو یورپ کی نقالی تھی اور دوسری طرف ہندو مفادات اور مسلمانوں کی نفرت ہی نفرت کا شاہدہ تھا۔ جب حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی دارالعلوم کے صدر مدرس ہوئے اور وہ شدّت سے عملی سیاست میں حصّہ لیتے رہے۔ خصوصاً اُن کی سیادت میں جمیعت العلمائے ہند نے کانگرس کا ضمیمہ ہونا قبول کر لیا۔ یہ سیاست حضرت کے نزدیک مطلقاً اسلام اور مسلمانوں کے وقار کے منافی تھی۔ خصوصاً عربی مدارس کی تو اس میں تباہی تھی۔ جب ممبران دارالعلوم کا ایک عنصر مولانا مدنی کا ہم خیال ہو گیا اور حضرت کے خلاف کانگرسی سیاست دارالعلوم میں داخل ہو گئی تو حضرت نے استعفیٰ دے دیا۔ اوّل اوّل ممبران نے استعفیٰ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مگر وجوہِ استعفیٰ میں کوئی تبدیلی نہ کی تو آخر میں حضرت نے خود اپنے استعفیٰ کا اعلان دارالعلوم کے دروازہ پر چسپاں کرا دیا اور سبکدوش ہو گئے۔[1]
تھانوی صاحب نے اس موقع پر مولوی شبیر احمد عثمانی صاحب کو ایک خط میں یوں لکھا۔

"میں تو علم الیقین سے بڑھ کر عین الیقین رکھتا ہوں کہ یہ کانگرسی

---

[1] مکتوب مفتی محمد شفیع مورخہ ۷ جولائی ۱۹۶۷ء ——— مولانا اشرف علی تھانوی اور تحریک آزادی، از پروفیسر احمد سعید مطبوعہ راولپنڈی / کراچی، صفحہ ۱۶۳، ۱۶۴

مسلک کی ترویج مدرسہ میں ڈالنا چاہتے ہیں"۔ [1]

ہمیں آج بھی یہی حسنِ ظن ہے کہ مولوی اشرف علی صاحب تھانوی نے علمائے دیوبند کی اکثریت کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے کانگریس کی مخالفت اور مسلم لیگ کی حمایت کی۔ مولوی شبیر احمد عثمانی اور مولوی اشرف علی تھانوی کا نام لے لے کر ہی تو آج نوجوان نسل کو یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ تحریک پاکستان میں علمائے دیوبند نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا تھا۔ لیکن قیامِ پاکستان سے پہلے ہی بعض دیوبندی اکابر نے تھانوی صاحب کے افکار کی روشنی میں ثابت کیا کہ موصوف مسلم لیگ اور قائدِ اعظم کے مخالف تھے۔

چنانچہ مولوی عبدالاحد صاحب مُحدّث نے ۱۹۴۶ء میں 'اشرف الافادات' کے عنوان سے ایک رسالہ تحریر کیا جس کا تعارف مولوی محمد میاں صاحب (والد مولوی حامد میاں صاحب مہتمم جامعہ مدنیہ لاہور) نے لکھا۔ اس رسالہ میں ایک جگہ مسلم لیگ کی مخالفت میں مولانا اشرف علی تھانوی کے اعلانات و بیانات ان کے خلفاء مولوی خیر محمد اور مولوی عبدالجبار ابوہری کی زبانی نقل کیے گئے ہیں۔

مولوی عبدالجبار ابوہری صاحب کے یہ الفاظ لائقِ توجہ ہیں :-

"حضرت والا نے لیگ کی بداعمالیوں اور مذہب دشمنی ملاحظہ فرما کر لیگ سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ جس مجلس مبارک میں حضرت والا نے یہ فرمایا تھا، مولانا ظفر احمد صاحب بھی موجود تھے اسی فرمان کو سُن کر مولانا ظفر احمد صاحب نے کہا کہ حضرت والا چند

---

[1] انوار عثمانی : مکتوب بنام مولانا شبیر احمد عثمانی صفحہ ۵۵

ماہ اور ٹھہر جائیے۔ حضرت حکیم الامت نے فرمایا کہ اب لیگ کی اصلاح کی امید بالکل ختم ہو گئی۔ میں ان حضرات سے خوب واقف ہوں۔ حضرت والا بار بار یہ شعر پڑھتے تھے۔

سے نہ خنجر اُٹھے گا نہ تلوار ان سے
یہ بازو میرے آزمائے ہوئے ہیں

ہاں یہ صحیح ہے کہ شروع شروع میں لیگ کے حامی تھے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حضرت حکیم الامت مسلم لیگ جیسی بد دین جماعت کی حمایت کریں۔ اب تو وہ قادیانیوں، دھریوں اور شیعوں کی مجتمع جماعت ہے۔ لہذا تمام متوسلین کے ذمہ یہ ضروری ہے کہ حضرت والا کا اتباع کرتے ہوئے لیگ سے علیحدگی اختیار کریں

(بحوالہ اخبار مدینہ ۱۷ر نومبر ۱۹۴۵ء)" [1]

یہ بات کسی لطیفے سے کم نہیں کہ مولوی اشرف علی صاحب تھانوی کے خلفاء تو انہیں مسلم لیگ اور تحریکِ پاکستان کا مخالف بتائیں اور آج کچھ لال بجھکڑ قسم کے نام نہاد محقق و مؤرخ انہیں نظریۂ پاکستان کا بانی قرار دیں۔

ایسے ہی ایک "محقق" منشی عبدالرحمان خان کی تازہ تحقیق ملاحظہ فرمایئے "تخیلِ پاکستان کے بانی مولانا اشرف علی تھانوی تھے نہ کہ علامہ اقبال ——— ایک تاریخی غلطی کا ازالہ" کے زیرِ عنوان لکھتے ہیں۔

" اسلامی سلطنت کے قیام کا جو خیال علامہ اقبالؒ نے مسلم لیگ

---

[1] مولوی عبدالاحد حوریؔ: اشرف الافادات مطبوعہ دہلی صفحہ ۱۸

نوٹ: یہ رسالہ حال ہی میں لاہور سے شائع ہو چکا ہے۔

کے متذکرہ بالا اجلاس میں پیش کیا تھا، بالکل وہی خیال ان سے بہت پہلے حضرت مولانا اشرف علیؒ تھانوی اپنی مجلسِ عام میں کئی بار ظاہر فرما چکے تھے۔ بلکہ اس کا مکمل خاکہ اور حصول پروگرام بھی بتا چکے تھے۔[1]

اس دعویٰ کی مضحکہ خیزی کا خیال کرتے ہوئے خود ہی آگے چل کر تشریح فرماتے ہیں۔

"ممکن ہے آپ کے لیے یہ انکشاف موجبِ حیرت ہو کیونکہ یہ بات علامہ اقبال کے اظہار کے پورے پچیس سال بعد منظرِ عام پر لائی جا رہی ہے مگر کسی بات کا علم میں نہ آنا اس کے غلط ہونے کی دلیل نہیں ہوتی۔"[2]

قیامِ پاکستان کے بعد

اپنوں اور پرایوں کی تمام تر مخالفتوں کے باوجود جب محض اللہ کے فضل وکرم سے مسلمانانِ ہند نے اپنے عظیم قائدؒ کی قیادت میں حصولِ پاکستان کی منزل کو پا لیا تو اب وارثانِ دیوبند نے دو بالکل مختلف بہروپوں میں کام شروع

---

[1] ہفت روزہ اذان ملتان' ۲۲۔ اگست تا ۲۸ اگست ۱۹۷۸ء صفحہ ۲۸

[2] ، ، ، ، ، ، ، ، ، ، ،

کیا تاکہ اس مملکت خداداد میں وہ اپنے مخصوص مفادات حاصل کر سکیں۔

منشی عبدالرحمان خان کی طرح ہر دیوبندی قلمکار نے یہ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگادیا کہ پاکستان کے تخیل سے لے کر قیام تک سب وابستگانِ دارالعلوم دیوبند ہی کا کارنامہ ہے۔ وہ تو غنیمت ہے کہ عینی شاہدوں کی ایک بڑی تعداد ابھی بقیدِ حیات ہے جو اس جھوٹ کے تار و پود بکھیرنے کا حق اور قدرت رکھتی ہے۔ ورنہ اگر تعاقب نہ ہو اور اس طرح کی "تحقیق" کو بے لگام چھوڑ دیا جائے تو نئی نسل مخالفینِ تحریک پاکستان کو ہی مجاہدینِ تحریک پاکستان سمجھنے پر مجبور ہو جائے۔

دوسرا گروہ مولوی حسین احمد مدنی کے سیاسی جانشینوں کا ہے جو بدقسمتی سے پاکستان میں مولوی شبیر احمد عثمانی کی جمعیت العلمائے اسلام پر قابض ہو گیا ہے۔ وہ نام تو عثمانی صاحب کا لیتے ہیں اور تحریکِ پاکستان میں ان کے حصّہ کو اپنے ماتھے کا جھومر بنا کر عوام کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن درحقیقت وہ آج بھی مولوی حسین احمد مدنی اور دوسرے کانگریسی علماء کے افکار کے امین ہیں اور

؎ وفا داری بشرطِ استواری

کے مصداق انہی کے ترجمان بنے ہوئے ہیں۔

یہ طائفہ جس نے پاکستان کو کبھی دل سے تسلیم نہیں کیا اور اس کے بعض سرکردہ لیڈر یہ کہتے ہوئے ذرا نہیں شرماتے کہ "خدا کا شکر ہے ہم پاکستان بنانے کے گناہ میں شریک نہیں ہیں" ——— بڑی دیدہ دلیری سے اس زود فراموش قوم کے سامنے خود کو تحریک آزادی کا ہیرو بنا کر پیش کرتا ہے اور ذرائع ابلاغ پر قابض ان کے گماشتے تاریخ کو مسخ کرنے

کی اس واردات میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

پاکستان جہاں اس گروہ کے سینے کا کانٹا ہے وہاں مسلم لیگ کا تیر بھی ان کے دل میں ہنوز ترازو ہے۔ چنانچہ گزشتہ ۲۳ سالہ تاریخ شاہد ہے کہ ان لوگوں نے ہمیشہ تحریکِ پاکستان کی مخالف قوتوں کا ساتھ دیا اور مسلم لیگی حکومتوں کے خلاف ریشہ دوانیوں اور مرکز گریز تحریکات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

تحریر ہو یا تقریر تحریکِ پاکستان اور مسلم لیگ کے خلاف بغض کہیں نہ کہیں چھلک ہی پڑتا ہے۔ مفتی محمود صاحب دیوبندی مکتبِ فکر کی کالعدم سیاسی جماعت، جمیعت العلمائے اسلام کے سابق سربراہ ہیں۔ ان کے ایک مضمون سے یہ اقتباسات ان کے سیاسی عقائد کی جھلکی دکھاتے ہیں۔

"جمیعۃ علمائے ہند[۱] نے جو قابلِ فخر کردار ادا کیا اس کا مقابلہ کوئی تحریک نہیں کر سکتی، مسلم لیگ کو تو چھوڑیں کہ جدوجہد کا لفظ اس کی لغت میں ہی نہ تھا، کانگریس بھی ابھی تک پوری طرح بیداری کے موڈ پر نہ آئی تھی کہ بیسویں صدی کے پہلے ربع کے اختتام پر جمیعۃ نے کامل آزادی کا نعرہ لگا کر جدوجہد کو نیا رنگ دیا۔" [۲]

---

[۱] وہی مولوی حسین احمد والی جمیعت جو کانگریس کی ذیلی تنظیم کے طور پر قیام پاکستان کی مخالفت میں پیش پیش رہی اور جس کا واحد مقصد مسلمانانِ ہند کے درمیان نااتفاقی پیدا کر کے ان کے علیحدہ آزاد وطن کے مطالبہ کو سبوتاژ کرنا تھا۔ (جاوید)

[۲] مفتی محمود: مضمون دارالعلوم دیوبند، تحفظ اور احیائے اسلام کی عالمگیر تحریک۔ ماہنامہ الرشید لاہور، فروری/مارچ ۱۹۷۶ء صفحہ ۳۶۶

"مکمل آزادی کا نصب العین سب سے پہلے جمیعۃ نے اختیار کیا۔
اس کے بعد کانگریس نے اور مسلم لیگ نے تو ۱۹۴۲ء میں ایسا کیا وہ بھی
بامرِ مجبوری"۔ [1]

مفتی صاحب ہوں یا ان کے کوئی دوسرے ہم مشرب' قائدِ اعظم علیہ رحمۃ کی قیادت اور مسلم لیگ کی جدوجہد کو تسلیم کرنے کے روادار نہیں ہو سکتے۔ ان کے نزدیک آزادی کی اصل جنگ وہی تھی جو گاندھی کی قیادت اور کانگریس کے ترنگے کے سایہ میں کانگریسی مولوی لڑتے رہے ہیں۔

پاکستان کی طرح بھارت میں موجود وارثانِ دیوبند بھی ابھی تک کانگریس کے ہمنوا اور ترجمان ہیں۔ چنانچہ گذشتہ دِنوں مولوی حسین احمد مدنی کے صاحبزادے مولوی اسعد مدنی پاکستان آئے تو طلبا کے ایک استقبالیے سے خطاب کرتے ہوئے کانگریسی حکومت اور بھارتی وزیرِ اعظم مسز اندرا گاندھی کے ساتھ دوستی کا حق ادا کر دیا۔ جس

[1] مفتی محمود، مضمون دارالعلوم دیوبند' تحفظ و احیائے اسلام کی عالمگیر تحریک۔ ماہنامہ الرشید لاہور' فروری/مارچ ۱۹۷۶ء صفحہ ۳۶

نوٹ: اس مضمون کا کچھ حصہ روزنامہ مشرق لاہور میں ' دارالعلوم دیوبند اور احیائے اسلام کی عالمگیر تحریک' کے عنوان سے ۱۹ مارچ ۱۹۸۰ء کو شائع کروایا گیا۔ لیکن شاید یہ بھی دیانت و امانت کا شاہکار ہی کہلائے گا کہ صاحبِ مضمون کے مسلم لیگ کے متعلق یہ ریمارکس "مسلم لیگ کو تو چھوڑیں کہ جدوجہد کا لفظ اس کی لغت میں ہی نہ تھا" حذف کر دیئے گئے۔

(جاری ہے)

پر قومی پریس نے بجا طور پر موصوف کے ان خیالات پر بروقت گرفت کی۔

علمائے دیوبند نے مسلمانوں کے علیحدہ آزاد وطن کے مقابلے میں ہندو کے ساتھ مل کر رہنے کی جو تاریخی غلطی کی تھی اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ آج وہ سیکولر بھارت میں مذہب کو اپنی مساجد و مدارس کی چار دیواری میں محصور کر دینے پر مجبور ہیں۔ ان کا ملی تشخص ڈھونڈے سے نہیں ملتا اور بھارت کی نوجوان مسلم نسل بجا طور پر محسوس کرتی ہے کہ ـــــــــ

"آزادی کے بعد کے تینتیس سالوں میں ہمیشہ شاذ و نادر ہی دارالعلوم دیوبند سے کوئی ایسی آواز اُٹھتی ہوئی نظر آتی ہے جس سے ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس درس گاہ کی چہار دیواری کے اندر زندگی گذارنے والی مخلوق کی نگاہیں اس چہار دیواری سے باہر بھی دیکھتی ہیں۔" [1]

اس عظیم "دارالعلوم کے اکابر نے ہندو کی قیادت کا جو جُوا اپنی گردنوں میں پہنا تھا۔ اس کا بوجھ بھارت میں مسلمانوں کی نئی نسل اب بھی اُٹھائے پھرنے پر مجبور ہے۔ اگر مسٹر گاندھی کو منبرِ رسول پر بٹھا کر گروہ علما اس کے قدموں میں بیٹھ کر اس طرح کی دُعا نہ کرتا کہ ـــــــــ

"اے اللہ! تو گاندھی کے ذریعہ اسلام کی مدد فرما۔" [2]

تو آج بھارت سے اس قسم کی خبریں نہ آتیں ـــــــــ

---

[1] ابوالکلام قاسمی، مضمون "دارالعلوم دیوبند، پس منظر اور پیش منظر" پندرہ روزہ خیر و خبر، علی گڑھ (بھارت) ۱۶ تا ۳۱ مارچ ۱۹۸۰ء صفحہ ۸

[2] عبدالنبی کوکب مقالاتِ یومِ رضا (حصہ اوّل) مطبوعہ لاہور ۱۹۶۸ء صفحہ ۹۸، ۹۹ مقالہ "مولانا احمد رضا خان کے رفقاء کی سیاسی بصیرت" از حکیم محمد موسیٰ امرتسری۔

"چودھویں ہجری صدی کے مبارک آغاز کے پُرمسرت موقعے پر ساری دنیا میں تقریبات کا انعقاد ہو رہا ہے۔ ہندوستان بھی کسی سے پیچھے نہ رہتے ہوئے نومبر کے پہلے ہفتے میں ایک سہ روزہ جشن بعنوان "جشنِ اسلام" کا اہتمام کرے گا۔ اس بات کی پوری کوشش ہو رہی ہے کہ یہ جشن بڑے اعلا پیمانے پر منعقد ہو اور کسی قسم کی کوئی خامی نہ رہے۔ توقع کی جاتی ہے کہ اس میں دُنیا بھر کے دانشور بڑی تعداد میں شریک ہوں گے ——

اس جشن کے رُوحِ رواں مسٹر حسن احمد ہیں جو کہ کُل ہند مُسلم یُوتھ کانفرنس کے صدر اور سنجے گاندھی کے بڑے معتمد ہیں"۔ [2]

گویا مجوزہ "جشنِ اسلام" کے رُوحِ رواں کی سب سے بڑی اور قابلِ ذکر خوبی یہ ہے کہ وہ بھارتی وزیرِاعظم مسز اندرا گاندھی کے بیٹے مسٹر سنجے گاندھی [3] کے "آدمی" ہیں —— اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ؀

---

[1] اسے فاضل مدیر کی بے خبری کہا جائے یا کچھ اور کہ وہ عالم اسلام سے پُوری ایک صدی پیچھے ہیں۔ (جاوید)

[2] کالم اپنا دیس۔ پندرہ روزہ نیرو خبر' علی گڑھ (بھارت) دارالعلوم دیوبند نمبر ۱۶-۳۱ مارچ ۱۹۸۰ء، صفحہ ۲۳

[3] اب آنجہانی

صد سالہ جشن

دارالعلوم دیوبند ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء کو قائم ہوا تھا۔ گویا سنِ ہجری کے اعتبار سے اس کی عمر ۱۱۸ سال اور سنِ عیسوی کے مطابق ۱۱۴ برس کی ہوتی ہے۔ لیکن ۱۴ یا ۱۸ سال کی تاخیر سے ۲۲ مارچ ۱۹۸۰ء کو اس مدرسے کا صد سالہ جشن دیوبند میں منایا گیا جس میں دُنیا بھر سے دیوبندی مکتبِ فکر کے لوگوں کے علاوہ مشرباً اور مسلکاً اِن کے قریب تر یعنی اہلِ حدیث اور مودودی صاحب سے متاثر افراد نے شرکت کی۔ لے

پاکستان کے ایک بزرگ صحافی جناب وقار انبالوی کو حیرت ہے کہ یہ جشن ۲۲ مارچ کو کیوں منایا گیا۔ ایک آدھ دن اِدھر اُدھر کر لیا جاتا تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑتی کہ یہ دن پاکستان میں مطالبۂ پاکستان کی قرارداد لاہور کی یاد میں 'یوم پاکستان' کے نام سے ایک قومی دن کے طور پر منایا جاتا ہے۔

ہمیں جناب وقار انبالوی کی سادگی پر حیرت ہے ورنہ کیا وہ نہیں جانتے کہ نہ تو یہ جشن عین سوویں سالگرہ کے موقع پر منایا گیا ہے اور نہ ہی ہجری یا عیسوی تاریخوں کا ہی کوئی خیال رکھا گیا ہے بلکہ بظاہر یوں لگتا ہے کہ علاقے کے

لے دیوبندی حضرات کے علاوہ پاکستان سے دیوبند یاترا پر جانے والے نمایاں لوگوں میں ڈاکٹر اسرار احمد، مولوی گلزار احمد مظاہری وغیرہ شامل ہیں۔

حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اندرا سرکار کو اپنی حمایت و فاداری کا یقین دلانے کے
لیے یہ محفل سجائی گئی اور شمعِ محفل بھی یہی دیوی جی ہی بنیں۔

اخباری اطلاعات[۱] کے مطابق معزز مہمانِ خصوصی یعنی مسز اندرا گاندھی ا
واجب الاحترام میزبان علمائے کرام کی تقاریر یہ کی قدرِ مشترک ——— اس "تا
فخر" ماضی کا تذکرہ تھی جس میں اس دارالعلوم کے اکابر کانگریس کے ہمنوا ہو کر مسلم
ہند کے متفقہ مطالبہ ——— قیامِ پاکستان ——— کے خلاف سرگرم
رہے۔

تاریخ برصغیر پر نظر رکھنے والوں کے لیے یہ چنداں تعجب کی بات نہیں۔
کہ ایک اسلامی دارالعلوم کے صد سالہ جشن کی تقریب میں نہرو کی لاڈلی بیٹی رو
محفل ہو کہ اس درسگاہ کے بڑے، جامع مسجد دہلی میں سوامی شردھانند کو او
جامع مسجد خیرالدین امرتسر میں مسٹر گاندھی کو منبرِ رسول پر لا بٹھانے کے تار
کارنامے انجام دے چکے ہیں۔

ہمارے نزدیک یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی خاص مصلحت کے تحت
ہے جو نئی نسل کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔ لوگوں کے حافظے کو کم
سمجھتے ہوئے محض پروپیگنڈے کے زور پر گذشتہ ۳۲ سالوں میں دیوبند
مکتبِ فکر کے علماء و قلم کار تحریکِ آزادی کے سلسلہ میں اپنی نام نہاد خدمات

---

[۱] روزنامہ نوائے وقت لاہور نے اپنی اشاعت مورخہ ۱۵ مئی ۱۹۸۰ء میں مسز اندرا گاندھی کی ت
کا متن شائع کر دیا ہے جو بھارت کے قونصل جنرل مقیم کراچی کے دفتر سے سرکا
طور پر جاری ہوا۔ قارئین کرام کی دلچسپی کے لیے اس کا عکس کتاب کے آخر میں شا
جا رہا ہے۔

کی فہرست کو جس طرح طول دیتے رہے ہیں اور اپنے بڑوں کی ہندو سے وارفتہ محبت کو چھپانے کی سعی کرتے رہے ہیں۔ اس تازہ واقعہ کے ذریعہ تاریخ نے خود کو دہرا کر حقائق کو بے نقاب کر دیا ہے۔

بعض حساس دلوں کو اس واقعے سے سخت ٹھیس بھی پہنچی ہے، جنہیں اس دارالعلوم سے محض علوم اسلامی کی وجہ سے تعلق خاطر رہا ہے ورنہ وہ اس کے ارباب بست وکشاد کے سیاسی مسلک سے الگ نقطۂ نظر رکھتے ہیں انہی میں مرحوم مولانا احتشام الحق تھانوی بھی تھے۔ جنہوں نے اندرا گاندھی کے ہاتھوں جشنِ دیوبند کے افتتاح کی خبر پڑھ کر بدست احتجاج کیا۔ بدقسمتی سے ان کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی اور مفتی محمود صاحب وعبید اللہ انور صاحب سمیت سارے اکابر علمائے دیوبند اندرا گاندھی کے بھاشن سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ مرحوم مولانا احتشام الحق تھانوی یہ غم اپنے سینے میں لے کر قبر کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر چکے ہیں اور ان کے نعرۂ حق پر توجہ نہ دینے والے دیوبندی علماء اب ان کی وفات پر تعزیتی قراردادیں منظور کر رہے ہیں۔

بہر حال قاری محمد طیب صاحب شکریہ کے مستحق ہیں جن کی وجہ سے مسلمانانِ برصغیر پر بالعموم اور نوجوانانِ پاکستان پر بالخصوص واضح ہو گیا ہے کہ اس درسگاہ کے اکابر کے روابط کانگریس اور نہرو خاندان سے کیا ہیں ——— کیا تھے ——— اور کیا رہیں گے ——— اور اس کے بعد یہ فیصلہ کرنا چنداں مشکل نہیں ہے کہ مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنے والوں کے ساتھ یارانہ نبھانے والے مسلمانوں کے دوست ہیں یا دشمن ۔ وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ